

بجٹ اور پاکستانی معیشت کو درپیش چیلنج

پروفیسر خورشید احمد

قومی زندگی میں بجٹ کو ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایسی دستاویز ہے جو ایک طرف حکومت کی پچھلے ایک سال کی آمدنی اور اخراجات اور آئندہ سال کے پورے مالی دروست کا میزانیہ ہوتی ہے، تو دوسری طرف اس کی اس سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں ملک کو درپیش حقیقی معاشی مسائل اور چیلنجوں کی صحیح تصویر قوم اور پارلیمنٹ کے سامنے آتی ہے۔ اس میں وہ پورا نقشہ کار بھی سامنے آ جاتا ہے، جو ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے حکومت کے پیش نظر ہوتا ہے۔ گویا حقیقت اور وزن دونوں ہی کا عکس اس میں دیکھا جاسکتا ہے۔

بجٹ: معاشی ترقی کا آئینہ

قوم اور پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہے کہ درج ذیل پہلوؤں سے بجٹ کا جائزہ لینے کا اہتمام کرے: اولاً: یہ حکومت کی ایک سال کی کارکردگی کا بے لاگ جائزہ لینے کا بہترین موقع ہوتا ہے جس کی روشنی میں دیانت اور انصاف کے ساتھ حکومت اور معیشت دونوں کی کارکردگی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو متعین کرنا چاہیے۔ ان کی روشنی میں مستقبل کے لیے جو سبق سیکھا جاسکتا ہے، اس کی بھی واضح الفاظ میں نشان دہی ہونی چاہیے۔ حکومت کو خود بھی یہ کام کرنا چاہیے اور پارلیمنٹ اور قوم کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ خدمت انجام دے۔ اس کا مقصد محض ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنا نہیں بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ ملک اور قوم کے وسائل کو عوام کی حقیقی بہبود کے لیے کس طرح خرچ کیا جائے اور اس سلسلے میں بہتر سے بہتر کی نشان دہی کی جانی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت اور

اپوزیشن، سرکاری ادارے اور سول سوسائٹی، دانش ور اور میڈیا، سب کی ذمہ داری ہے کہ اس بجٹ کے موقع پر اس جائزے اور احتساب کے عمل میں اپنا اپنا کردار ادا کریں۔

ثانیاً: مسئلہ محض ایک سال کی کارکردگی کا نہیں بلکہ معیشت کے باب میں حکومت کی بنیادی حکمت عملی کے تعین اور پھر اس حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بنائی جانے والی پالیسیوں، ترجیحات، ان پر عمل کے لیے وسائل کے حصول اور ان کے صحیح استعمال کے واضح نقشہ کار کا تعین اور ان کا تنقیدی جائزہ ہے، تاکہ ملک صحیح سمت میں ترقی اور عوام کی فلاح و بہبود کو یقینی بنایا جاسکے۔

ان دونوں مقاصد کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بجٹ اور اس پر بحث کو محض ان چند دنوں کی بجٹ اور منظوری کا قصہ نہ سمجھا جائے، بلکہ بجٹ پر سوچ، چار کا عمل ہر مرحلے میں، اس پر پارلیمنٹ میں بحث اور منظوری کے دوران، اور منظوری کے بعد اس پر عمل درآمد کے پورے عمل میں جاری و ساری رہنا چاہیے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں بجٹ کو محض چند دنوں کا ایک تماشا سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ دنیا کے جمہوری ممالک میں بجٹ اور اس کا جائزہ پورے سال پر پھیلا ہوا ایک مسلسل عمل ہے۔ پارلیمنٹ اور اس کی کمیٹیاں پورے سال معاشی اور مالی امور کے باب میں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ بجٹ سازی صرف حکومت کا کام نہیں بلکہ اس میں معیشت و معاشرت کے تمام ہی کردار (اسٹیک ہولڈرز) دیانت داری سے اپنا اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پارلیمنٹ کی کمیٹیاں اور سول سوسائٹی کے ذمہ دار ادارے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں اور حکومت کو اپنا نتیجہ فکر فراہم کرتے رہتے ہیں۔ نصف سے زیادہ ممالک میں پارلیمنٹ بجٹ پر بحث کے لیے دو سے چار مہینے صرف کرتی ہیں اور اس طرح بجٹ کی منظوری کے لیے پارلیمنٹ کم سے کم ۲۵ دن سے لے کر چار مہینے تک وقف کرتی ہے، جب کہ ہمارے ملک میں اسے چند دن میں نمٹا دیا جاتا ہے۔ اس سال ۵ جون کو بجٹ پیش ہوا ہے اور ۲۳ جون کو اسے منظور کر لیا گیا۔ گویا ۸ دن میں اور اگر چھٹی کے دن نکال دیے جائیں تو صرف ۱۴ دن میں بجٹ کا ہر مرحلہ پورا ہو گیا۔ یہ بجٹ اور قوم دونوں کے ساتھ ایک سنگین مذاق ہے۔ پاکستان کا سینیٹ کم از کم پچھلے سات سال سے برابر یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ بجٹ پر بحث کے دورانیے کو بڑھایا جائے، بجٹ سازی کے ہر مرحلے میں پارلیمنٹ اور عوام کو شریک کار بنایا جائے،

سالانہ معاشی سروے بجٹ سے محض ۲۴ گھنٹے پہلے شائع نہ کیا جائے، بلکہ کم از کم دو ہفتے پہلے آئے، تاکہ اس کی روشنی میں بجٹ کا جائزہ لیا جاسکے۔ ہندستان میں بجٹ پر ۴۵ دن بجٹ لازمی ہے، برطانیہ میں اس عمل میں چار مہینے لگتے ہیں، امریکا میں یہ عمل پورے سال اور کانگریس کے دونوں ایوانوں میں جاری رہتا ہے۔ خصوصیت سے 'تخصیصی کمیٹی' (Appropriation Committee) کا کردار مستقل اور مسلسل ہے اور ایک ایک سرکاری خرچ کے لیے پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہے۔ اسی طرح 'ضمنی بجٹ' کا معاملہ بھی فیصلہ طلب ہے۔ سینیٹ نے اس کی ہمیشہ مخالفت کی ہے اور موجودہ وزیر خزانہ جب اپوزیشن میں تھے تو یہ بھی ہماری طرح اس کے بڑے ناقد تھے۔ ان سے توقع تھی کہ وہ پارلیمنٹ کے حقوق پر شب خون مارنے کے اس مسلسل عمل کو ہمیشہ کے لیے روکنے میں کردار ادا کریں گے۔ لیکن ان کے حالیہ اور سابقہ بجٹ میں وہی پرانی کہانی دہرائی گئی ہے اور اس سال (۱۵-۲۰۱۴ء) یہ رقم ۱۴-۲۰۱۳ء کے مقابلے میں تقریباً دوگنی ہو گئی ہے، یعنی ۲۰۵ ارب روپے، جو پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر بجٹ سے بالا بالا خرچ کیے گئے اور بعد از خرچ اب ان کی منظوری کی محض کاغذی کارروائی کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ ان ۲۰۵ ارب روپے میں بلا منظوری اخراجات میں صرف ضابطے کی تبدیلیوں (technical reallocation) کا تعلق ۶۷ ارب روپے سے ہے، جب کہ ۱۳۸ ارب روپے ان مدت پر خرچ ہوئے ہیں، جن پر کوئی خرچ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتا اور جنہیں 'نئی تجاویز' (fresh allocations) کہا جاتا ہے۔ جب ان تفصیلات پر نگاہ ڈالی جائے جو ان 'غیر معمولی اہمیت' کے حامل نادیدہ مصارف کی رپورٹ میں بیان کرنی پڑی ہیں، تو انسان کے چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ ان میں VVIP جہاز پر ۱۳ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے اور ۳۵ لاکھ روپے کی گاڑیوں کی مد میں ۲۰ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے بھونک دیے گئے ہیں۔ یہ اضافی مطالبات زر (ضمنی بجٹ) ایک ناقابل معافی زیادتی ہیں جس کا دروازہ بند ہونا چاہیے۔

بجٹ پر بجٹ کے دوران اگر حکومت اور اس کے اتحادیوں نے غلت کے ساتھ اور آنکھیں بند کر کے اسے منظور کر کے قوم اور ملک کے ساتھ انصاف نہیں کیا، تو وہیں پر اپوزیشن کی جماعتیں بھی جواب دہ ہیں کہ جنہوں نے فیصلہ کن مراحل پر بجٹ میں عدم شرکت اور بائیکاٹ کا راستہ اختیار کر کے، اپنی ذمہ داری کما حقہ ادا نہیں کی۔ البتہ جہاں ہم اپوزیشن کے اس رویے پر تنقید کر رہے ہیں،

وہیں اس امر کا اعتراف بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ کم از کم دو جماعتوں نے بجٹ تجاویز بڑے مرتب انداز میں پیش کیں۔ تحریک انصاف نے متبادل بجٹ پیش کر کے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ اسی طرح جماعت اسلامی پاکستان کے امیر اور سیکرٹری جنرل نے بجٹ سے پہلے بجٹ کے لیے مثبت تجاویز پیش کیں۔ اخبارات اور میڈیا میں بھی اچھی بحث ہوئی اور آزاد تحقیقی اداروں نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ خصوصیت سے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز نے بجٹ سے پہلے بھی اپنی تجاویز پیش کیں اور بجٹ کے آنے کے بعد اس پر بھی اپنا مبسوط تجزیہ پیش کیا۔ اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ بجٹ سازی میں تمام اسٹیک ہولڈرز اپنا اپنا کردار ادا کریں۔

معاشی ترقی کا حکومتی دعویٰ

۱۶-۲۰۱۵ء کا بجٹ مسلم لیگ (ن) کی مرکزی حکومت کا تیسرا بجٹ تھا۔ حکومت کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس نے گذشتہ دو سال میں معیشت کو دیوالیہ ہونے کے بحران سے نکال کر بڑے پیمانے پر استحکام (macro stabilization) کی راہ پر ڈال دیا ہے اور اب وہ معاشی ترقی کی سمت بڑی جست لگانے کی پوزیشن میں ہے۔ بجٹ میں وزیر خزانہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اب وہ معاشی ترقی کے لیے فیصلہ کن اقدام کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو اگر حقائق پر مبنی ہو تو بہت خوش آئند ہے، لیکن اگر حقائق کوئی اور تصویر پیش کر رہے ہوں تو یہ ایک خطرناک مغالطہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے بجٹ، اس کے وسائل اور تجاویز کی روشنی میں اس دعوے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

گذشتہ بجٹ جسے استحکام کی راہ ہموار کرنے والی دستاویز قرار دیا گیا تھا، اس میں ۱۵ اہداف سامنے رکھے گئے تھے۔ سالانہ معاشی دستاویزات کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ ان ۱۵ میں سے صرف چار ایسے ہیں، جن میں حکومت اپنے اہداف حاصل کر سکی ہے۔ بیرونی ذخائر ۱۷ ارب ڈالر کی حد پار کر گئے ہیں، جو ایک اچھی خبر ہے۔ افریڈ زر کی شرح کے بارے میں دعویٰ ہے کہ ۸ فی صد سے کم ہو کر ۸ فی صد پر آ گئی ہے۔ ٹیکس کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی بھی اپنے ہدف کے قریب پہنچ گئی ہے اور ٹیکسوں سے بالاسرکاری آمدنی (non-tax revenue) میں ہدف سے تقریباً ۲۵ فی صد اضافے نے مجموعی محصولات کی پوزیشن مثبت کر دی ہے۔

تصویر کے اس مثبت پہلو کے ساتھ منفی پہلو کا ادراک بھی ضروری ہے: معیشت کی شرح نمو

(growth rate) جسے ۱۴-۲۰۱۳ء کے ۴ فی صد سالانہ کے مقابلے میں ۱۵ء فی صد ہونا تھا، وہ صرف ۲۰۱۲ء فی صد ہو سکی، یعنی ہدف سے ۲۵ فی صد کم۔ زراعت میں ترقی کی رفتار مایوس کن رہی، یعنی چار فی صد کے ہدف کے مقابلے میں صرف ۲۹ فی صد۔ مویشیوں کی افزائش (livestock) کے باب میں غیر معمولی اضافے (یعنی ۷ فی صد) کی وجہ سے مجموعی پیداوار میں اضافے کا سراب رونما ہوا۔ حکومت کے انتظامی اخراجات ہدف سے زیادہ اور ترقیاتی اخراجات میں کمی واقع ہوئی جس سے محصولاتی خسارہ بڑھ گیا۔ یہی معاملہ تجارتی خسارے کا رہا کہ درآمدات اور برآمدات کا فرق آسمان کو چھو رہا ہے۔ برآمدات میں ۴ فی صد کمی ہوئی ہے۔ تیل کی قیمتوں میں نصف سے زیادہ کمی کے باوجود درآمدات میں خاطر خواہ کمی نہیں ہوئی۔ اگر بیرون ملک پاکستانیوں کی ترسیلات میں نمایاں اضافہ نہ ہوتا اور ۳-جی اور ۴-جی کی فروخت سے 'اندھی آمدنی' (windfall income) نہ ہوتی تو ملک دیوالیہ ہونے کے دہانے پر کھڑا ہوتا۔ زراعت کی طرح سب سے پریشان کن صورت حال صنعت کی ہے۔ بڑے پیمانے کی صنعت (LSM) اپنے ہدف کا نصف بھی حاصل نہیں کر سکی جس سے بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ صرف ٹیکسٹائل کی صنعت میں ۳۰ فی صد کمی ہوئی اور اس کی وجہ سے ۲۰ لاکھ افراد بے روزگار ہوئے ہیں۔ اس پر متزادہ اضافہ ہے، جو ہر سال محنت کاروں (labour force) میں آبادی کے اضافے کی وجہ سے ہو رہا ہے، یعنی تقریباً ۱۸ لاکھ افراد سالانہ۔ بیرونی سرمایہ کاری گذشتہ ۱۵ سال کے مقابلے میں ۱۵ سال سب سے کم رہی ہے، یعنی اب ۸۰۰ ملین ڈالر کے پھیرے میں آگئی ہے، جو سال گذشتہ کی تقریباً نصف ہے۔ اور اگر اس کا مقابلہ اس رقم سے کیا جائے، جو غیر ملکی سرمایہ کار سابقہ سرمایہ کاری کے منافع کے طور پر سالانہ ملک سے باہر لے جاتے ہیں، تو اس سال کی سرمایہ کاری، منافع کی منتقلی سے جو ایک ارب ڈالر سے زیادہ ہے، سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ پاکستانی سرمایے کی غیر ممالک میں منتقلی کو بھی شامل کر لیا جائے، جو ایک باخبر اندازے کے مطابق ۲۰ ارب ڈالر سالانہ کے لگ بھگ ہے، تو بڑی ہی بھیانک تصویر سامنے آتی ہے۔

حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے دو سال استحکام کے ہدف کے حصول کے لیے وقف کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نام نہاد استحکام (stabilization) کی یہ پالیسی حکومت سے زیادہ

عالمی مالیاتی فنڈ' کی پالیسی ہے۔ اس پالیسی پر پچھلے دو سال نہیں، سات سال سے عمل ہو رہا ہے۔ اس کے موجودہ دور کا آغاز پیپلز پارٹی کی گذشتہ حکومت نے کیا تھا اور موجودہ حکومت نے ماضی کی حکومت سے کچھ زیادہ ہی مستعدی سے اس پر عمل کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سات برسوں میں بھی ہم معاشی استحکام حاصل نہیں کر سکے۔ ملک کا پیداواری عمل سخت جمود کا شکار ہے۔ زراعت اور صنعت دونوں ہی کی حالت دگرگوں ہے۔ صرف مالیاتی سیکٹر اور سروسز سیکٹر متحرک اور نفع بخش ہیں، جن کے نتیجے میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران ملک اس صورت حال سے دوچار تھا، جسے معاشیات کے ماہر stagflation کہتے ہیں، یعنی معیشت میں جمود اور ملک میں افراط زر۔ ان دو سال میں ہم 'افراط زر کے ساتھ معاشی جمود سے تو نکلے ہیں، لیکن ایک دوسری دلدل میں دھنس گئے ہیں، جسے Low-growth trap (پیداوار میں سُست روی کا جال) کہا جاتا ہے۔ حکومت نے جو حکمت عملی اختیار کی ہے اور جس پر 'عالمی مالیاتی فنڈ' اور عالمی ادارے تعریفوں کے ڈونگرے برسا رہے ہیں، وہ اس دلدل سے نہیں نکال سکتی۔ اس کے نتیجے میں تو قرضوں کا بار بڑھتا ہی رہے گا اور ماضی کے قرض ادا کرنے کے لیے نئے قرض لینے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا، جو کسی صورت قابل برداشت (sustainable) نہیں ہے۔

ہماری قرضوں کی غلامی کی کیفیت یہ ہے کہ قیام پاکستان سے ۲۰۰۱ء تک ۵۲ برسوں میں قرض کا بار ملک پر ۲۵۷۳۱ ارب روپے تھا۔ جو، جنرل پرویز مشرف دور حکومت میں بڑھ کر ۲۰۰۸ء تک دوگنا ہو گیا، یعنی ۶۱۲۶ ارب روپے۔ پیپلز پارٹی کے پانچ سال کے تحفے کے طور پر یہ قرض بڑھ کر ۱۴ ہزار ۹۳ سو ۹۳ ارب روپے ہو گیا۔ اب مسلم لیگ حکومت کا عطیہ یہ ہے کہ مجموعی قرض ۱۶ ہزار ۹ سو ۳۶ ارب روپے ہے۔ ان سوا دو سال میں تقریباً تین ہزار ارب کا اضافہ ہو گیا ہے اور آج صرف سود کی ادائیگی حکومت کے مصارف میں سرفہرست ہے، یعنی سرکاری مصارف کا تقریباً ۳۱ فی صد، جو اب دفاعی مصارف سے بھی ۵۰ فی صد زیادہ ہے، اور اگلے سال ۱۲۸۰ ارب روپے صرف سود کی ادائیگیوں کے لیے درکار ہیں۔ پاکستان کا ہر بچہ، جوان اور بوڑھا ایک لاکھ تین ہزار روپے فی کس کا مقروض ہے۔ نیز حکومت ۲۰۰۵ء کے قرضوں کی حد پر پابندی کے قانون کی بھی مسلسل خلاف ورزی کر رہی ہے اور پارلیمنٹ اور عدالتیں سب 'ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم' کی تصویر بنی ہوئی ہیں۔ بد قسمتی

سے یہ معاشی استحکام، کانہیں دائمی معاشی عدم استحکام، کا راستہ ہے، اور حکومت کا حال یہ ہے کہ مع
زہر دے، اس پہ یہ اصرار کہ پینا ہوگا

درپیش معاشی چیلنج

حکومت کا دعویٰ تھا کہ وہ: انتظامی اخراجات میں کمی کرے گی، کفایت شعاری کی روش
اعتیار کرے گی اور ملک میں اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہوگی اور
خود وزیراعظم اس کی پہلی مثال قائم کریں گے۔ وزیر خزانہ نے بجٹ کی تقریر میں بڑے واضح الفاظ
میں فرمایا تھا: ”وزیراعظم صاحب نے فیصلہ کیا ہے کہ اس عمل کا آغاز وہ اپنے دفتر سے کریں گے۔“

۱۳-۲۰۱۲ء میں وزیراعظم کے آفس کا بجٹ ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے تھا، جسے ۱۳-۲۰۱۳ء
کے لیے ۴۵ فی صد کم کر کے بجٹ میں ۳۹ کروڑ ۶۰ لاکھ پر رکھا گیا۔ لیکن عمل کی کیفیت کیا رہی؟

۱۳-۲۰۱۳ء کا ترمیم شدہ بجٹ ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ تھا جو ۱۵-۲۰۱۳ء میں بڑھ کر ۸ کروڑ ۱۰ لاکھ ہو گیا
اور اب ۱۶-۲۰۱۵ء کے بجٹ میں ۸۲ کروڑ ۲۰ لاکھ مقرر کیا گیا ہے۔ نیز خبر ہے کہ ایک ارب روپے
اس کے علاوہ ہیں، جو گذشتہ سال میں وزیراعظم کے دفتر کو فراہم کیے گئے ہیں، مگر اس کی تصدیق
کرنے کے باوجود کہ ایسا ہوا ہے، بجٹ کی دستاویزات میں اس کا ذکر نہیں (ایکسپریس ٹریبیون،
۶ جون ۲۰۱۵ء)۔ اس طرح وزیراعظم آفس کے روزانہ اخراجات ۲ لاکھ ۷ ہزار روپے بنتے ہیں۔ دوسری
طرف ایوان صدر کے اخراجات ۳ کروڑ ۳۳ لاکھ تھے، جنہیں نظر ثانی شدہ بجٹ میں ۴ کروڑ ۹۲ لاکھ
کر دیا گیا اور اب تازہ بجٹ میں بڑھا کر ۸ کروڑ ۱۰ لاکھ تک پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہے۔

بد قسمتی سے شاہ خرچیوں کا بازار ہر شعبہ زندگی میں گرم ہے۔ اور اچھی حکمرانی کا کہیں وجود
نہیں۔ شخصی پسند و ناپسند کی بنیاد پر پورا کاروبار حکومت تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا گیا ہے۔
حیرت کی بات ہے کہ ملک کو ہمہ وقتی وزیر قانون، وزیر دفاع، وزیر خارجہ میسر نہیں۔ ۵۰ سے زیادہ
اہم سرکاری عہدوں اور اداروں کے سربراہ یا ڈائریکٹرز میں سے عدالت عظمیٰ کے حکم پر صرف دو چارجگہ
تقرریاں ہوئی ہیں، باقی سب خالی پڑی ہیں۔ خالص ٹیکنیکل وزارتوں اور عہدوں پر ایسے لوگوں کا
تقرر کیا گیا ہے، جنہیں متعلقہ فن کی ہوا بھی نہیں لگی۔ کرپشن کا دور دورہ ہے اور میڈیا اور عدالتوں
میں ایک سے ایک بڑا اسکینڈل ہر روز سامنے آرہا ہے، مگر حکومت کے کان پر جوں نہیں ریگنتی۔

وزیر خزانہ صاحب بڑے فخریہ انداز میں عدوی، اسٹینڈرڈ اینڈ یور، وال اسٹریٹ جرنل اور دی اکانومسٹ کے مثبت تبصرے بیان کرتے نہیں تھکتے، لیکن اس سوال کا کوئی جواب دینے کو تیار نہیں کہ اگر یہ سب سبز باغ ارضِ وطن کو آراستہ کر چکے ہیں تو ملک میں غربت ۵۰ فی صد سے زیادہ کیوں ہے؟ اور یہ بھی عالمی بینک ہی کی رپورٹ ہے کہ ۹ کروڑ سے زیادہ افراد آج غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور آبادی کا ۲۰ فی صد اس کس مہر سی کے عالم میں ہے، جسے شدید غربت اور موت و حیات کی کش مکش کہا جاتا ہے۔

عالمی بینک ہی کی رپورٹ کے مطابق پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کا ۶۱،۳۱ فی صد کم خوراک کی اور 'کسر وزن' (under weight) کا شکار ہے۔ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات اور زچہ کی شرح اموات میں پاکستان عالمی برادری میں پست ترین سطح پر ہے۔ ہیومن ڈویلپمنٹ انڈیکس میں ہم دنیا کے ۱۸۷ ممالک میں ۱۳۳ ویں مقام پر ہیں۔ ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ بچے ایسے ہیں، جو اسکول جانے کی عمر میں ہیں لیکن تعلیم سے یکسر محروم ہیں اور جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کا کیا حال ہے۔ یہ ایک دوسری دل خراش داستان ہے مع تن ہمہ داغ داغ شد، پنہ کجا کجا بم۔

حکومت خوش ہے کہ اسٹاک مارکیٹ میں اضافہ ہو رہا ہے، لیکن یہ ایک معما ہے کہ ملک کا پیداواری سیکٹر سکڑ رہا ہے، برآمدات کم ہو رہی ہیں، ٹیکسٹائل صنعت جو کبھی ہمارا طرہ امتیاز تھی، آج زبوں حالی کا شکار ہے۔ دوسری طرف بنگلہ دیش کی ٹیکسٹائل برآمدات، پاکستان کی برآمدات سے دوگنی ہو گئی ہیں۔ ملک میں سرمایہ کاری میں کمی ہو رہی ہے۔ گذشتہ سال نجی شعبے کی سرمایہ کاری میں ۳۰ فی صد کمی ہوئی ہے لیکن اسٹاک ایکسچینج میں حصص کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ یہ صرف سٹے کی وجہ سے ہی ممکن ہے، اور یہی وجہ ہے کہ امیر طبقہ روپے سے روپے ڈھال رہا ہے اور ملک کی معیشت اور عام آدمی اس بہتی لنگا سے کوئی حصہ نہیں پار رہے۔ ۲۰ فی صد متوسط طبقہ اور خصوصیت سے اشرافیہ کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں اور عام آدمی دوقت کی روٹی سے محروم ہے۔ بڑے بڑے ہولوں، شادی ہالوں، اونچے طبقے کے خریداری کے مراکز پر نظر ڈالیے، قیمتی گاڑیوں کے کاروانوں کو دیکھیے، شہروں میں محلات کی اگلی فصلوں پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف فراوانی ہی فراوانی ہے۔ لیکن اگر آبادی کے نصف سے زیادہ کے حالات کو دیکھیے تو آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں۔

ملک میں عدم مساوات بڑھ رہی ہے۔ ایک حالیہ سرکاری رپورٹ Household Integrated Economic Survey کے مطابق ملک میں ۵۰ لاکھ افراد ایسے ہیں، جن کی خاندانی آمدنی ۱۵ لاکھ سالانہ سے زیادہ ہے۔ لیکن انکم ٹیکس دینے والوں کی تعداد صرف ۸ لاکھ ہے۔ دوسری طرف ۴۷ فی صد آبادی وہ ہے جس کی روزانہ آمدنی ۲۰۰ روپے سے بھی کم ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایسی مثالیں نہیں ملتیں کہ بھوک کی بنا پر کوئی موت واقع ہوئی ہو، یا کسی نے اس کی وجہ سے خودکشی کی ہو۔ لیکن آج پاکستان میں یہ مثالیں بھی رُو نما ہو رہی ہیں اور بڑھ رہی ہیں۔

کیا بجٹ میں ان حالات کا کوئی حقیقی ادراک موجود ہے؟ کیا حکومت نے کوئی ایسی حکمت عملی بنائی ہے، جس سے ملک ایسی معاشی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے، یا جس میں ملک کے وسائل سے عام آدمی مستفید ہو سکے؟ اس کی زندگی میں تبدیلی آ سکے، اسے روزگار میسر آ سکے، وہ اپنی ضروریات زندگی عزت کے ساتھ پوری کر سکے؟ اس کے بچے تعلیم حاصل کر سکیں، اس کے سر پر چھت اور پیٹ میں روٹی ہو۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت کے اس تیسرے بجٹ میں کوئی جھلک ایک حقیقی تبدیلی کی نظر نہیں آتی۔ نہ معاشی ترقی کا کوئی ایسا واضح تصور سامنے آتا ہے جو معاشی اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہو۔ جس میں قوم ترقی اور خود انحصاری کے راستے پر گامزن ہو سکے، جس کے نتیجے کے طور پر عام افراد کی زندگی میں خوش حالی رُو نما ہو سکے۔ جو دولت کی منصفانہ تقسیم اور ملک کے تمام علاقوں، خصوصیت سے پس ماندہ علاقوں، طبقات کو شاد کام کر سکے۔

وزیر خزانہ نے اگلے سال کے لیے ۵ فی صد شرح نمو کی بات کی ہے اور ۲۰۱۸ء تک ۷ فی صد پر لے جانے کی خوش خبری دی ہے۔ لیکن لیبرل سرمایہ دارانہ معیشت کا جو راستہ یہ حکومت آئی ایم ایف، عالمی بینک اور عالمی مالیاتی اداروں کی خواہش کے مطابق اختیار کیے ہوئے ہے، اس کے نتیجے میں ہمیں دُور دُور تیز رفتار، مستحکم اور منصفانہ ترقی کے وقوع پذیر ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ معیشت کو حقیقی ترقی کے راستے پر ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ بیرونی اور اندرونی قرضوں کے چنگل سے نکلا جائے اور ملک کے اپنے وسائل کو دیانت اور محنت کے ساتھ بروئے کار لایا جائے۔ اس کے لیے قیادت کو فکری اور اخلاقی دونوں اعتبار سے ایک اعلیٰ مثال قائم کرنی ہوگی۔ ملک میں وسائل کی کمی نہیں ہے، ضرورت صحیح قیادت، صحیح منصوبہ بندی، اچھی حکمرانی اور سب سے

بڑھ کر معاشی ترقی کے اس عمل میں پوری قوم کو، خصوصیت سے اس کے نوجوانوں کی شرکت کو عملی صورت دینے کی ہے۔ اس قوم میں بڑی صلاحیت ہے، لیکن بد قسمتی سے وہ قیادت مفقود ہے جو اس صلاحیت کو بیدار اور منظم کر سکے۔ ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے موقع پر سب نے دیکھا کہ کس طرح خیبر سے کراچی تک قوم کے ہر طبقے اور خصوصیت سے نوجوانوں نے آفاتِ سماوی کے مقابلے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کی اور خدمت کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی۔ کیا قوم کی اس صلاحیت کو آزادی کی حفاظت اور ایک خوش حال اسلامی پاکستان کی تعمیر کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا؟

مسلم لیگ کا منشور اور حقائق

مسلم لیگ (ن) نے اپنے ۲۰۱۳ء کے منشور میں 'مضبوط معیشت، مضبوط پاکستان' کا خواب دکھایا تھا اور ہم بدلیں گے پاکستان کا جھنڈا لے کر قوم کو تعاون و تائید کے لیے پکارا تھا۔ اس میں جس منزل کو اپنی منزل قرار دیا گیا تھا وہ 'خوددار، خوش حال، خود مختار پاکستان' تھا۔ وعدہ کیا گیا تھا کہ: ہم وی آئی پی کلچر کا خاتمہ اور کفایت کی مہم کا آغاز کریں گے، خاص طور پر صدر، وزیر اعظم، گورنر اور وزراے اعلیٰ سے متعلق اخراجات غیر معمولی طور پر کم کیے جائیں گے۔ منشور کے چند اہم نکات کو ذہنوں میں تازہ کرنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان دو سال اور تین بجٹوں میں قوم اس منزل کی طرف بڑھی ہے یا ساری دوڑ دھوپ اسی پرانی ڈگر پر رہی ہے جس سے نجات کے لیے قوم سے مینڈیٹ لیا گیا تھا:

- تمام آمدنی پر ٹیکس لگانا، اور براہ راست ٹیکس پر انحصار بڑھا کر ٹیکس سے آمدنی کے نظام کو مبنی بر انصاف بنانا۔ ● آئی ٹی ڈیٹا بیس کے زیادہ استعمال کے ذریعے ٹیکس سسٹم کی بنیاد کو وسیع کرنا۔ ● ٹیکس کی عدم ادائیگی کم کرنا۔ ● ٹیکس انتظامیات میں اصلاح کرنا۔ ● تمام ایشیا کے لیے معیاری نرخ یقینی بنا کر سیلز ٹیکس کو معقول بنانا۔ ● منی لانڈرنگ اور کالے دھن کو سفید کرنے کے خاتمے کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرنا۔ ● ایشیائے تیش کی درآمد کی حوصلہ شکنی کرنا، اور غیر ضروری درآمدات پر ریگولٹری ڈیوٹی عائد کرنا، یقینی بنانا۔ ● گیس اور بجلی تمام شہری اور دیہی صارفین کو ایک قابل ادائیگی قیمت پر مسلسل مہیا کی جائیں گی۔ ● پانی اور بجلی، پٹرولیم اور قومی وسائل کے انضمام سے توانائی اور قومی وسائل کی ایک وزارت قائم کرنا۔

● نپیر کی اصلاح کرنا۔ ● بجلی کی تقسیم کی کمپنیوں کی اصلاح کرنا۔ ● بجلی کے بلوں کو ۰.۰۰ فی صد سے قریب ترین ممکنہ سطح تک وصول کرنا۔ ● گردشی قرضے کا مستقل خاتمہ کرنا۔ ● دیہی معیشت جو ریزہ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، اور چھوٹے کاشتکاروں پر توجہ دینا اور ٹکنالوجی کو فروغ دینا پیداواری inputs (یعنی کھاد، بیج، کرم بارادویہ وغیرہ) تک ان کی رسائی یقینی بنانا۔ ● تحفظ خوراک کا حصول، خاص طور پر ان ۳۰ فی صد کے لیے جو ۲۰۱۲ء میں خوراک کے عدم تحفظ کا شکار تھے۔ ● خوراک کے حق کو دستوری ترمیم کے ذریعے دستوری حق قرار دینا۔ ● روزگار کی فراہمی کے ایسے پروگرام کو رواج دینا جن میں لیبر کا استعمال زیادہ ہو (labour intensive) ● قومی تعلیمی ایمر جنسی نافذ کرنا تا کہ ناخواندگی کو جنگی بنیادوں پر ختم کیا جاسکے۔ ● تعلیم کا یکساں نظام مرحلہ بہ مرحلہ نافذ کیا جائے گا۔ ● ڈل سطح تک ۰.۰۰ فی صد داخلے اور ترقی کے مقاصد کے تحت ۸۰ فی صد ناخواندگی حاصل کرنا (واضح رہے کہ یہ عالمی ترقیاتی منصوبے کا حصہ ہے جسے دسمبر ۲۰۱۵ء تک مکمل ہونا تھا اور پاکستان اس معاہدے کا حصہ ہے۔)

ہم نے تذکیر کے مخلصانہ جذبے سے مسلم لیگ کے منشور کے ان دعوؤں کو یہاں پیش کیا ہے۔ مگر کیا کوئی دیانت داری سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اس تیسرے بجٹ میں جو درمیانی مدت (mid-term) کی حیثیت رکھتا ہے، اس وژن کی کوئی جھلک بھی نظر آتی ہے؟ ہم تو بار بار کی کوشش کے باوجود روشنی کی کوئی کرن نہ دیکھ سکے! ہمیں دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ غالباً منشور کا یہ وژن عوام کو سبز باغ دکھانے کے لیے تھا، حکومت کی پالیسیوں اور بجٹ پر اس کا کوئی سایہ دُور دُور تک نظر نہیں آتا ہے۔

ہماری نگاہ میں اس بجٹ کی سب سے بڑی ناکامی یہ ہے کہ اس میں حالات کا صحیح تجزیہ اور معیشت کو درپیش مسائل اور چیلنجوں کا کوئی ادراک موجود نہیں ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ اعداد و شمار کی ایک اچھی مشق ہے، جس میں حالتِ زار کو جوں کا توں (status quo) باقی رکھنے کا بندوبست ہے۔ اس حقیقی تبدیلی اور وہ بھی بنیادی تبدیلی کا کوئی اشارہ ہمیں دُور دُور نظر نہیں آتا جس کے بغیر ملک کو معاشی بحرانوں اور قرض کی غلامی کی دلدل سے نکالنا ممکن نہیں۔

بجٹ اور سروے میں پوری کوشش کی گئی ہے کہ تصویر کا ایک رُخ دکھایا جائے اور ماضی کی غلطیوں اور خود اپنی پالیسیوں کے نتائج کے بے لاگ اور معروضی تجزیے کے صحت مندراستے کے

مقابلے میں الفاظ کے گورکھ دھندے اور اعداد و شمار کے داؤ پیچ سے ایک ایسی منظر کشی کی جائے، جس کے ذریعے اصل حقائق کو نظروں سے اوجھل رکھا جاسکے۔ ہم اس سلسلے میں چند مثالیں اہلی نظر کے غور و فکر کے لیے پیش کرتے ہیں:

افراط زر کے بارے میں دعویٰ ہے کہ وہ ۲۰۰۸ء فی صد پر آ گیا ہے، حالانکہ عام آدمی کا تجربہ یہ ہے کہ ایشیائے خورد و نوش جن کا ایک عام آدمی کے بجٹ میں بڑا حصہ ہوتا ہے، نہ صرف یہ کہ ان کی قیمتوں میں کمی نہیں ہوئی ہے بلکہ اضافہ ہوا ہے۔ دی نیوز کے نمائندے نے جون سال گذشتہ اور جون ۲۰۱۵ء کے بازار سے حاصل کردہ جو نرخ دیے ہیں، وہ نہ صرف اضافہ بلکہ ۱۰ سے ۲۰ فی صد اضافے کی خبر لاتے ہیں۔

وزیر خزانہ کا دعویٰ ہے کہ بے روزگاری میں کمی ہوئی ہے اور لیبر فورس کے ۶۰۳ فی صد سے کم ہو کر ۶ فی صد پر آ گئی ہے، جب کہ پاکستان پلاننگ کمیشن اور قومی اقتصادی کونسل (NEC) کی دستاویزات کی روشنی میں اس وقت بے روزگاری کی شرح ۸.۳ فی صد ہے۔ حکومت ہی کے اداروں کے دیے ہوئے اعداد و شمار میں ۲۵ فی صد کا فرق ہے۔

کس کا یقین کیجیے، کس کا یقین نہ کیجیے

لائے ہیں ان کی بزم سے یار خبر الگ الگ

وزیر خزانہ کا دعویٰ ہے کہ اس سال معیشت ۲۵ لاکھ افراد کو نیا روزگار دے سکے گی۔ لیکن معاشی ماہرین انگشت بدندان ہیں کہ معیشت کے ۵ فی صد شرح نمو پر یہ کیسے ممکن ہے؟ اس کے لیے کم از کم ۸ فی صد شرح نمو ضروری ہے۔ پھر جس ملک میں کئی کروڑ افراد بے روزگار ہوں یا رزق کی عام سہولتوں سے محروم ہوں، اور جس میں ۲۰۲۰ء فی صد آبادی میں سالانہ اضافے کے نتیجے میں ہر سال ۱۸ لاکھ افراد کا روزگار کی تلاش کرنے والی فوج میں اضافہ ہو رہا ہو، اس میں ۵ فی صد کی شرح نمو سے ۲۵ لاکھ افراد کے لیے روزگار کے مواقع کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟ معاشیات کے طالب علموں کے لیے یہ باور کرنا محال ہے۔

حکومت کا اپنی پالیسیوں کے باب میں نظر ثانی سے اجتناب اور غیر متعلق امور کو معاشی مشکلات کا سبب قرار دینے کی روش کبھی بھی صحت مند نہیں ہو سکتی۔

وزیر خزانہ نے کہا ہے: ”معاشی ترقی میں اضافے کی رفتار کو مجرد کرنے والے عوامل میں عالمی منڈیوں میں قیمتوں کی کمی اور ملک میں پانچ مہینے تک دھرنوں کا بڑا دخل ہے۔“ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالمی منڈیوں میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کا اثر صرف پاکستان پر کیوں پڑا؟ ہمارے ہی جیسے دوسرے ملکوں کی ترقی کی شرح ان سے کیوں متاثر نہیں ہوئی؟ بھارت، بنگلہ دیش، ملائیشیا، سری لنکا، سب کی شرح نمو اور برآمدات پر منفی اثرات کیوں نہیں پڑے؟ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہماری درآمدات کے سستا ہو جانے کے مثبت اثرات ہماری معیشت پر کیوں نہیں پڑے؟ قیمت کم ہونے سے درآمدات کی مقدار (volume) کے مقابلے میں قدر (value) میں کمی ہونا چاہیے تھی مگر درآمدات کی قدر میں برائے نام کمی ہوئی ہے اور تجارتی خسارہ اور بڑھ گیا ہے۔

اسی طرح دھرنے کے نقصانات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے، حالانکہ اگر اس کا کوئی اثر پڑا بھی ہوگا تو وہ محدود ہوگا۔ البتہ ایک مطالعے کے مطابق پاکستان میں افراط زر کی شرح دھرنے سے پہلے ۹ء۶ فی صد تھی جو اگست ۲۰۱۴ء میں ۷ فی صد اور دسمبر ۲۰۱۳ء میں ۳ء۳ فی صد تھی۔ یہ تبدیلی مثبت ہے یا منفی، حکومت کو غور کرنا چاہیے۔ اسی طرح اگر ملک کی برآمدات کو لیا جائے، تو جولائی اور اگست میں درآمدات میں کمی واقع ہوئی یعنی ۹ء۶ فی صد اور ۶ء۳ فی صد، لیکن نومبر میں ۵ء۹ فی صد کا اضافہ ہوا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس عمل اور دھرنوں میں کوئی باہم تعلق نہیں۔ ملک میں بڑی صنعتوں کی پیداوار کے رجحان کو اگر دیکھا جائے تو صورت حال یہ سامنے آتی ہے کہ: جولائی میں اضافہ ۵ء۴ فی صد، اگست میں ۴ء۴ فی صد، ستمبر میں ۳ء۳ فی صد، اکتوبر میں ۲ء۲ فی صد، نومبر میں ۵ء۴ فی صد، دسمبر میں ۶ء۹ فی صد۔ یہاں بھی اعداد و شمار کسی واضح منفی رجحان کی خبر دینے سے قاصر ہیں۔

(ایکسپریس ٹریبیون، ۱۳ جون ۲۰۱۵ء)

دھرنے کی افادیت یا اس کا مضر ہونا ہمارا موضوع نہیں۔ ہماری دل چسپی صرف اس بات سے ہے کہ وزیر خزانہ کو دلیل اور مبالغہ آمیز نعرے بازی میں فرق کرنا چاہیے اور معاشی حقائق کی روشنی میں پالیسیوں اور ان کے اثرات کا تجزیہ معروضی انداز میں کرنا چاہیے، تاکہ ان سے صحیح سبق حاصل کیا جاسکے ورنہ ہم خود بھی مغالطے کا شکار ہوں گے اور قوم کی بھی صحیح حالات کے سمجھنے میں مدد نہیں کر پائیں گے۔

معجزہ حکمت عملی

ملک کو جن معاشی حالات اور چیلنجوں سے سابقہ درپیش ہے، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مناسب حکمت عملی درکار ہے۔ اس کی کوئی جھلک اس بجٹ میں نظر نہیں آتی، بلکہ مسئلے کے پورے پورے ادراک کا بھی فقدان ہے۔ تو انسانی کے مسئلے کو جو اہمیت دی جانا چاہیے تھی وہ مفقود ہے۔ ٹیکس کی چوری، ٹیکس کے نیٹ ورک کی تنگ دامنی، معیشت میں ضیاع کے بڑے بڑے جھرنوں کا بدستور پھیلنا لا پرواہی اور بے حسی کا عذاب، اسمگلنگ اور بڑے پیمانے پر کرپشن اور اس کی تباہ کاریوں کے سلسلے میں حکومت کوئی واضح پالیسی اور پروگرام دینے میں ناکام رہی ہے۔ اس بارے میں دو آرا مشکل ہیں کہ ملک میں ٹیکس وصولی کے جو امکانات ہیں اس کا بمشکل ایک تہائی اس وقت حاصل ہو رہا ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ فیڈرل بورڈ آف ریونیو (ایف بی آر) کا کردار اس میں محدود اور مشتبہ ہوتا جا رہا ہے۔ ذرائع آمدنی پر ٹیکس جمع کرنے کے نظام کو بھی عملاً ٹھیکے پر دے دیا گیا ہے۔ ۳۵ لاکھ سے زیادہ افراد کو ٹیکس کے دائرے میں ہونا چاہیے، مگر عملاً صرف ۸ لاکھ افراد ہیں جو ٹیکس دے رہے ہیں۔ ساری معلومات اور دعوؤں کے باوجود ٹیکس نا دہندہ افراد کو ٹیکس نیٹ میں لانے میں ایف بی آر ناکام رہا ہے۔ عالمی بینک اور لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنس کے ایک تحقیقی مطالعہ (۲۰۱۳ء) کے مطابق پاکستان کے موجودہ ٹیکس ادا کرنے والے ۸ لاکھ افراد سے جو ٹیکس وصول کیا جا رہا ہے، وہ ان کے واجب الادا ٹیکس کا صرف ۳۸ فی صد ہے، باقی ۶۲ فی صد کرپشن کی نذر ہو رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر ان لاکھوں افراد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے، جن کو ٹیکس دینا چاہیے اور وہ نہیں دے رہے، تب بھی جو ٹیکس دے رہے ہیں، صرف ان کا اگر تمام واجب الادا ٹیکس وصول کیا جائے تو اس وقت ۳ ہزار ارب روپے کے بجائے اسے ۸ ہزار ارب روپے ہونا چاہیے۔ گویا ۵ ہزار ارب روپے صرف ان ٹیکس دینے والوں کے کھاتے سے کرپشن کی نذر ہو رہا ہے۔ تحقیق میں یہ بھی متعین کیا گیا ہے کہ اس ۵ ہزار ارب روپے کو ٹیکس گزار افراد، ٹیکس جمع کرنے والے عملے اور دوسرے سہولت کاروں کے درمیان تقریباً درج ذیل تناسب سے اڑایا جا رہا ہے: ۷۰ فی صد ٹیکس دینے والے ۲۵ فی صد ٹیکس جمع کرنے والے ۵۰ فی صد ٹیکس میں سہولیات فراہم کرنے والے۔

اگر ان تمام ۳۰ سے ۳۵ لاکھ کو بھی ٹیکس کے نیٹ ورک میں لے آیا جائے، جو اس وقت ٹیکس کے نیٹ ورک سے باہر ہیں اور اگر ٹیکس کی شرح میں کمی بھی کر دی جائے، تب بھی کم از کم ۸ ہزار سے ۱۰ ہزار ارب روپے تک مزید محصولات حکومت کو حاصل ہو سکتے ہیں۔

وسائل کے غلط استعمال اور اخراجات کے باب میں کرپشن کی کہانی اس کے علاوہ ہے۔ اندازہ ہے کہ کم از کم ۱۳ ارب ڈالر کی سالانہ اسمگلنگ ملک میں ہو رہی ہے۔ 'غیر دستاویزی معیشت' کے بارے میں اندازہ ہے کہ وہ 'دستاویزی معیشت' سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔ گویا اس وقت کل معیشت کا صرف ۳۰ فی صد دستاویز شدہ، باقی قانون کی گرفت سے باہر ہے۔

ایک حالیہ مطالعے کی روشنی میں صرف چین سے تجارت کے باب میں یہ حیرت ناک بات سامنے آئی ہے کہ پاکستان کی چین سے درآمدات ۹ ارب ڈالر سالانہ دکھائی جا رہی ہیں، جب کہ چین کے شعبہ تجارت اور شماریات کے مطابق چین کی پاکستان کو درآمدات ۱۵ ارب ڈالر ہیں۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہمارے اور چین کے دیے ہوئے اعداد و شمار میں ۶ ارب ڈالر کا فرق ہے۔ کیا یہ حکومت کی ذمہ داری نہیں کہ بیرونی اور ملکی قرضوں کے ذریعے حکومتی اخراجات اور ترقیاتی مصارف پورے کرنے کے بجائے خود اپنے وسائل کو ملکی معیشت کی تعمیر کے لیے منظم و متحرک کرے اور بیرونی وسائل کو متوازن انداز سے خرچ کرے تاکہ خود انحصاری کے ذریعے ترقی کا راستہ اختیار کیا جاسکے۔

ہماری نگاہ میں ایف بی آر کو مکمل طور پر 'اور ہال' کرنے، اس ادارے سے کرپشن کا خاتمہ کرنے، ایمان دار اور باصلاحیت افراد کو اس ادارے کی ذمہ داری سونپنے اور مناسب نگرانی کا نظام بنانے کو اولیت دینے کی ضرورت ہے۔ اس ادارے میں مکمل خود اختیاری بھی ضروری ہے، جس کی برسوں سے مزاحمت کی جا رہی ہے۔ صرف اس ایک اصلاح سے حالات میں جوہری تبدیلی رونما ہو سکتی ہے۔

واضح رہے کہ ہانگ کانگ ۱۹۸۱ء کی دہائی تک دنیا کے کرپٹ ترین ممالک میں سے تھا، لیکن چینی حکومت نے وہاں کرپشن کو ختم کرنے کے لیے موثر انتظام کیا اور سیاسی مداخلت سے پاک نظام قائم کیا، جس نے صرف تین سال میں ہانگ کانگ سے کرپشن کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا۔ یہ محض دیوانے کا خواب نہیں۔ اگر ایمان دار اور باصلاحیت قیادت ہو تو یہ کام چند سال میں انجام دیا جاسکتا ہے۔

دوسرا بڑا مسئلہ ترقی کے وژن اور ترجیحات کا ہے۔ ہمیں لبرل سرمایہ دارانہ تصورات کے طلسم

سے نکلنا ہوگا۔ خوش حالی اس وقت ممکن ہے جب معاشی ترقی محض دولت مند طبقے کے لیے مالی فراوانی کے مترادف نہ ہو جائے، بلکہ ہر اعتبار سے معاشی اور سماجی، تمام طبقات اور تمام علاقوں کی ترقی اور خوش حالی سے عبارت ہو۔ اس کے لیے مارکیٹ کا وجود تو ضروری ہے مگر مارکیٹ کی حکمرانی میں یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ریاست کو اس پورے عمل میں ایک مثبت کردار ادا کرنا ہوگا، لیکن خود کاروباری بن کر نہیں، بلکہ تمام عوام کے حقوق کے محافظ اور ان کی خوش حالی کو یقینی بنانے والے کی حیثیت سے۔ ریاست کا یہ تصور 'واشنگٹن کنسنسس' (Washington Consensus) اور عالمی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔ 'حکومت کا بزنس میں کوئی کام نہیں، محض سرمایہ داروں کا بنایا ہوا ایک فلسفہ ہے، جس کے نتیجے میں اس نعرے کے نام پر بزنس مین، حکومت اور ریاست پر قابض ہو جاتا ہے اور انہیں اپنے مفادات میں استعمال کرتا ہے۔ اگر حکومت کا بزنس سے کوئی کام نہیں ہے تو اس سے زیادہ بزنس مین کا یہ کام نہیں کہ وہ حکومت کرے۔ حکومت اور بزنس دو الگ الگ میدان ہیں۔ بزنس مین کو قانون اور اجتماعی مفاد کے دائرے میں بزنس کا ہر موقع ملنا چاہیے، لیکن ریاست کی مشینری کا اس کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ریاست کو سب کا مائی باپ ہونا چاہیے، اور اس سے بھی زیادہ اس کا کام وہ ہونا چاہیے جس کا اعلان حضرت ابو بکر صدیقؓ نے زمام اختیار سنبھالتے وقت کیا تھا کہ "تمہارا طاقت ور میرے لیے کمزور ہے جب تک میں اس سے تمہارا حق حاصل نہ کر لوں، اور تمہارا کمزور میرے لیے اس بات کا حق دار ہے کہ میں طاقت ور سے اس کا حق حاصل کر کے اصل حق دار تک پہنچاؤں"۔

یہ ہے وہ تصور ریاست جس میں معاشی ترقی اور حقیقی خوش حالی قائم ہو سکتی ہے اور ایک بار پھر یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے کہ زکوٰۃ دینے والے ان لوگوں کو تلاش کریں جو زکوٰۃ کے مستحق ہوں، اور معاشرے میں زکوٰۃ دینے والے ہوں اور لینے والے ناپید۔

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا